eISSN: 2791-0342
pISSN:2791-0334

سلیم الرحمن کی نظم کا علامتی پہلو

Symbolic aspect of Salim-ur-Rahman's poems

Jahangir Taj
MPhil Scholar
Govt. College University, Lahore

Dr Adnan Tariq
Assistant Professor, Department of Urdu
Govt. College University, Lahore

جہاں گیر تاج
ایم۔فل اسکالر
گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور

ڈاکٹر عدنان طارق
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو
گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور

Abstract:
Salim-ur-Rahman is counted among the great poets of new poetry. His poems have a special style in terms of expression. He has broadened the scope of Urdu poetry especially with allegorical and symbolic style. His symbolic poems are very meaningful. A certain urban background can be seen in his poems. The city exists in his poetry as a huge symbol, with many smaller symbols in the background. Hospital, sick girl, eyes, river and forest are the special symbols of his poetry. Undoubtedly, his symbols are very eloquent and have a layered meaning. This is the reason why he is counted among the modern symbolic poets of Urdu.

Key Words:
Symbol, Dadaism, Surialism, Hospital, River, Modernism, Cassical era

اردو شاعری کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ہر عہد میں شعرا کرام نے علائم ورموز کا سہارا لیا ہے، چوں کہ علامتی اسلوب سے نہ صرف معنویت میں اضافہ ہوتا ہے بل کہ کلام کی وقعت میں بھی اضافت ہوتی ہے۔ ہر دور کی علامتیں اپنے عہد کی نمائندگی کرتی ہیں۔ یہ علامتیں اپنے عہد میں تو جدید ہو سکتی ہیں لیکن ہر عہد میں نہیں۔ کلاسیکی دور کی علامتیں اپنے عہد میں ایک خاص معنویت رکھتی تھیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ زمانے کی ضروریات پورا کرنے سے عاجز آ گئیں۔ کلاسیکی عہد میں گل وبلبل، شمع وپروانہ، باغبان وصیاد، چمن، دشت اور شہر وغیرہ کی علامتیں برتنے کا ایک خاص رواج رہا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ علامتی نظام میں بڑی سرایت سے تبدیلی ہوئی۔ متاخرین کے دور میں اگرچہ علامتیں تو بہت حد تک وہی رہیں لیکن اس کی معنویت میں شعرا نے وسعت پیدا کر دی، جب کہ جدید دور کے شعرا کی علامتیں کلاسیکی عہد سے بہت زیادہ پیچیدہ اور تہ دار ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ شعرا نے دانستہ طور پر علامت نگاری پر خاص توجہ دی ہے

۔ جدید علامت نگاری میں اقبال، میراجی، راشد، فیض، مجید امجد، وزیر آغا، منیر نیازی اور سہیل احمد خان نے انتہائی وقیع اضافے کیے ہیں۔ جس سے نہ صرف علامتی نظم کا دامن حد درجہ وسیع ہوا ہے، بل کہ اس کی معنویت اور جمالی خوبیوں میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد شعراء نے ایک خاص علامتی، تجریدی اور تمثالی اُسلوب اپنایا۔ اس خاص ماحول میں ایک عجیب سی سیاسی و سماجی اور معاشرتی گھٹن نے بھی علامتی اسلوب کو برتنے میں شعرا کو اکسایا۔ مزید بر آں شعرا نے علامتی تحریک اور جدید تھیوریز کا بھی گہرا اثر قبول کیا۔ اس سلسلے میں اشتیاق احمد رقم طراز ہے:

"یہ شعرا علامتی تحریک کے علاوہ دادازم، سرئیلزم کی تحریکوں سے بھی بہت متاثر تھے اور ان کی تحریکوں کے طریق کار کو شعر و ادب بالخصوص نظم نگاری میں سمونے کے متمنی تھے۔"(1)

اس عہد میں جہاں انفرادی سطح پر مختلف شعراء اور ادباء نے کوشش کی، وہیں اجتماعی سطح پر کچھ رجحان اور تحریکیں بھی منظرِ عام پر آئیں۔ نئی شاعری اور لسانی تشکیلات کی تحریک اس سلسلے میں بہت اہم ہے، کیوں کہ اس تحریک نے نہ صرف کئی لسانی تجربات کیے، بل کہ علامتی اور تجریدی پہلو بھی اُجاگر کیے۔ اس تحریک کے گرو افتخار جالب کو تسلیم کیا جاتا ہے، جنھوں نے نظریاتی بنیادوں پر اس تحریک کو نہ صرف وضع کیا، بل کہ شاعری میں عملی مظاہرہ کیا۔ دیگر اہم شعرا میں ڈاکٹر انیس ناگی، ڈاکٹر سلیم الرحمٰن، زاہد ڈار، عباس اطہر، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، عبدالرشید، جیلانی کامران، اختر احسن، گوہر نوشاہی، آفتاب اقبال شمیم، اعجاز فاروقی اور ڈاکٹر سعادت سعید شامل ہیں۔ لیکن یہاں صرف ڈاکٹر سلیم الرحمٰن کی نظم نگاری کا علامتی مطالعہ ہی مقصود ہے۔

سلیم الرحمٰن کی نظم ایک خاص علامتی اور تمثیلی پہلو لیے ہوئے ہے۔ اگر ہم محض ان کے شعری مجموعوں "شام کی دہلیز"، "اجنبی سرد آسمان" اور "مسافرت کا چاند" کے ناموں پر ہی غور کریں تو وہ بھی علامتی رنگ لیے ہوئے ہیں۔ "شہر" ان کے ہاں ایک بہت بڑی علامت ہے، جس کے دائرے میں بے شمار چھوٹی چھوٹی علامتیں موجزن ہیں۔ در حقیقت انھوں نے شہری زندگی کے پس منظر میں اس دور کے نوجوانوں کے داخلی بحرانوں کو موضوع سخن بنایا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی علامتیں اپنے عہد کے نوجوانوں کی داخلی دنیا کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ ان کی علامتی نظم در حقیقت اس دور کا ایک مکمل بیانیہ ہے۔ شہری زندگی کے پس منظر میں انھوں نے انسانی مسائل اور کرب کو انتہائی چابک دستی سے بیان کیا ہے۔ ان کی نظم "شہر اور زنجیر" معاشرتی کرب کی تمثال ہے۔ شہری زندگی نے انسان کو پابہ گِل کر دیا ہے۔ اُس کے پاؤں میں زنجیر ہے، جس نے اُسے جکڑا ہوا ہے۔ اُس کی نت نئی اُلجھنیں اُس کے لیے وبالِ جان بنی ہوئی ہیں۔ سارا دن انسان ویران گلیوں میں ننگے پاؤں کنکروں پر چلتا ہے۔ اُس کے پاؤں چھلنی ہو جاتے ہیں۔ اُس پر طرفہ پاؤں زنجیر سے بندھے ہوئے ہیں۔ یہاں زنجیر ایک ایسی علامت کے طور پر اُبھرتی ہے، جس نے ہر شہری کو قید کیا ہوا ہے۔ موجودہ انسان صارفی معیشت اور معاشرتی ناہمواریوں میں

اس قدر اُلجھ گیا ہے کہ بہ ظاہر اُس کو لگتا ہے، وہ آزاد ہے لیکن حقیقت اس سے یکسر مختلف ہے۔ گویا وہ اسی محکومی اور بے بسی کے عالم میں زندگی کرنے کی تگ و دو کر رہا ہے۔

کھلی بارکوں میں

درختوں کے چمکیلے پتوں پر گرتی ہوئی روشنی میں

کبھی چاند کے نیلگوں سائے میں بیٹھ کر

درد کے تیز کانٹے نکالوں گا، چپ چاپ!

بجھتی ہوئی رات کے آخری پہر میں

سُونے بستر کی ڈستی ہوئی ناگنوں پر

میں بھوکے بدن کو رُلاتا رہوں گا(2)

یہاں کھلی بارکیں، درد کے تیز کانٹے، سُونے بستر پر ڈستی ہوئی ناگنیں اور بھوکے بدن کو رُلانے جیسی تمثالیں جہاں انسانی بے بسی کا اظہار کر رہی ہیں، وہیں اُس کی کرب ناکی کا بھی مظہر ہیں۔

شام کی دہلیز میں شامل دو نظمیں "بیمار لڑکی" اور "ہسپتال" ڈاکٹر سلیم الرحمٰن نے اس زمانے میں تحریر کیں، جب وہ خود میڈیکل کے طالب علم تھے۔ ان دونوں نظموں میں انھوں نے علامتی اور تمثالی پہلو اختیار کیا ہے۔ "بیمار لڑکی" ایک ایسے معاشرے کی علامت کے طور پر سامنے آتی ہے، جس کا فرد ایسے مرض میں مبتلا ہو چکا ہے، جس کا علاج ممکن نہیں ہے۔ وہ مریض جانتا ہے کہ اُس کی زندگی کا فیصلہ ہو چکا ہے لیکن وہ زندگی کرنے کی آس نہیں چھوڑ رہا۔ وہ فرد اگرچہ اپنے مسیحاؤں سے اُکتا چکا ہے، لیکن ہمت اور آس نہیں توڑ رہا۔ یہاں مسیحا وہ افراد ہیں جو معاشرے کے درد کا درماں ہونے کا واشگاف اعلان کرتے ہیں۔ غور طلب بات ہے کہ وہ بیمار فرد ان مسیحاؤں کے نام نہاد نعروں سے واقف ہے اسی لیے آزاد فضاؤں کی طرف رجوع کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر محمد حسن کی رائے بہت وقیع ہے:

> "حُسن اور حسن بیمار، دوشیزگی اور وہ بھی جینے کی شدید خواہش کے ساتھ اور اس کے ساتھ بیماری وہ جو لاعلاج ہے۔ گویا یہ ایک طرح کا عالم آشوب ہے کہ ہماری دنیا بھی اپنی تمام دلفریبی اور دلکشی کے باوجود اس قسم کے کرب میں مبتلا ہے، عالم نزع میں ہے اسے جینے کی خواہش بھی ہے او

راس خواہش کے پورے ہونے کا امکان بھی بہت کم ہے۔ وہ اپنے نام نہاد معالجوں سے تنگ آ کر
ہواؤں کی آزاد روی سے مسیحائی چاہتی ہے۔ شام کا لفظ واضح اشارہ ہے۔"(3)

آج کا فرد جس قدر ہجوم میں 'تنہا، ہو گیا ہے، اس کا واضح عکس اس نظم میں جھلکتا ہے اُسے اپنے دُکھ تنہا سہنے پڑ رہے ہیں۔ مزید بر آں جینے کی اُمنگ تو ہے، لیکن اُسے اپنے انجام کا بھی ادارک ہے، یہی سبب ہے کہ وہ مایوس اور ناتواں ہو چکا ہے اور اس عالم تنہائی اور لاچاری میں پکار تا ہے:

اونچے اونچے درختوں کی غم ناک سی چھانو ہے!

میرے سرہانے کا ننھا مُنا دریچہ کئی بار کھلتا رہا

جگمگاتی ہوئی روشنی آئی، موسم بدلتا رہا

چاندنی رات میں پھول کھلتے مگر میں نے دیکھے نہیں

دل میں سہمی خواہشوں کے

کبھی ہونٹ ہلتے مگر میں نے نہیں دیکھے نہیں

میں نے جب ڈرتے ڈرتے کبھی آنکھ کھولی

مرے چاروں جانب دُھند لکا سا تھا!

میں نے چپکے سے جب بھی سانس لی

میری رگ میں سمٹا ہوا میرا دُکھ کم نہیں ہو سکتا

میں نے نیلے خلاؤں میں اُڑتے ہوئے پنچھیوں کو صدا دی

مگر میرا کوئی نہیں تھا!

آج بھی میرا کوئی نہیں(4)

نظم کے آخری دو مصرعے معاشرے میں فرد کی کرب ناکی کا اظہار بڑے موثر انداز میں کر رہے ہیں۔ اسی طرح نظم "ہسپتال" کو اُس معاشرے کا مکمل عکس سمجھنا چاہیے، نظم میں چھوٹی چھوٹی تمثالیں اور علامتیں مل کر ایک بہت بڑی علامت بن جاتی ہیں۔ ہسپتال دُکھی انسان کے لیے جہاں ہر درد کا درماں ہے، وہیں دُکھوں، تکلیفوں اور امراض کی آماج گاہ بھی ہے۔ ہر طرف خزاں کا منظر نامہ پیش ہو رہا ہوتا ہے اور سارے پھول گردنیں جھکائے سوکھ رہے ہوتے ہیں۔ یہاں زرد پھولوں کی سوکھی اور جھکی ہوئی گردنیں، اُن مریضوں کے لیے نی طور علامت آئی ہیں جو مختلف بیماریوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ جن کی دھڑکنیں لرزاں ہیں اور آنکھیں مایوسی میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ سلگتے جسموں میں بے چین ہڈیوں کا چٹخنا لاچار اور لاغر افراد کی تمثالیں ہیں۔ نظم کا یہ اقتباس دیکھیے:

خزاں کی ویران رہگزاروں پہ

خشک پتوں کی کھڑ کھڑاہٹ

ہزار دُکھ کی کتھا کہانی سنا رہی ہے

کہاں تلک کوئی

زرد پھولون کی سُوکھتی ان جھکی ہوئی گردنوں کو

چُپ چاپ دیکھ کر سوچتا رہے

اور مہیب بے سلسلہ خیالوں کے تانے بانے سے بُنتا جائے

کبھی کواڑوں کو ہولے سے کھٹکھٹاتی

ہوا کی دستک کو سنتا جائے

سسکتی اور ڈولتی ہوئی دھڑکنوں کو

گنتا رہے کہاں تک؟

ہر ایک مایوس آنکھ اب منتظر ہے

ہمدرد، رحم دل، مہربان شب کی

کہ اُجلے اُجلے پروں کو پھیلائے نیند آئے

چٹختی بے چین ہڈیوں میں

سُلگتے جسموں میں!

آ جگائے سُکوں کا جادو،(5)

نظم میں گو کہ ایک اسپتال کا منظر نامہ بیان کیا ہے، لیکن پس پردہ پورے معاشرے میں موجود انسان کی بیماری، دُکھ، ذہنی ونفسیاتی اُلجھنوں کا بھرپور مرقع کھینچا گیا ہے۔ ایک اُداس اور مایوس فضا پوری نظم میں موجود ہے۔ معاشرے میں مایوسی کے اگرچہ محرکات بیان نہیں کیے، لیکن اُس درد اور غم کی کرب ناکی صاف عیاں ہے۔ نظم کے اختتام میں شاعر اس بیمار معاشرے کو اُمید دلاتا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ سب گھاؤ بھر جائیں گے اور پھر سے بہاریں لوٹ آئیں گی۔

کہ رُت پھرے گی، نئی نویلی ہوا چلے گی

ہری بھری مست آستینیں ہوا میں

پھر پھڑ پھڑائیں گی، گنگنائیں گی

زرد خشک سی ٹہنیاں ہنسیں گی

یہ بستیاں رنگ روپ میں

پھر رسیں گی(6)

ڈاکٹر سلیم الرحمٰن کی نظم "آنکھیں" شہر کے اس سارے منظر نامے کو بیان کرتی ہے۔ "آنکھیں" ایسے فرد کی علامت کے طور پر سامنے آتی ہیں، جو سب کچھ بے بسی سے دیکھ کر اندر ہی اندر کُڑھتا ہے اور سارا دن شہروں میں ماحولیاتی اور معاشی استحصال دیکھنے کے بعد ان آنکھوں کو نیند کے سُکھ سے آشنا کرنا چاہتا ہے۔ سیاہ رات میں کسی نرم ونازک بدن کو دھیان کے محل میں سجا کر روح تک کو تسکین پہنچانا چاہتا ہے۔ درحقیقیت شہری زندگی میں معاشی و معاشرتی استحصال کی بہ دولت اَن گنت ادھوری خواہشات لیے انسان خود کو نیند کے سپرد کر دیتا ہے۔

سارا دن شہر کی نیلی نیلی رگوں میں

دھڑکتی ہوئی زندگی کا سماں

پیلے پیلے مکانوں کی رنگت، سیہ چمنیوں کا دُھواں

دیکھتے دیکھتے،

درد نس نس میں گھُلنے لگا ہے

سارا دن کالے حرفوں کی بے جان لمبی قطاروں کے پیچھے

بھٹکتے ہوئے

من سے اُجلی سی ہر بات اُتری ہے(7)

"بوڑھے سانپ کی موت" بھی اسی نوع کی ایک نظم ہے، جس میں شاعر نے سانپ کو ایک اسطوری علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔ سانپ ہندو دھرم میں دیوتا کا درجہ رکھتا ہے، جو مذہبی اور تہذیبی علامت ہے۔ یہاں سانپ کے پسِ پردہ شاعر اُس صدیوں پرانی تہذیب کا تذکرہ کر رہا ہے، جو اپنے ہی زہر سے مرنے کے در پر ہے۔ "بوڑھے سانپ کی موت" کے پسِ پردہ شاعر اس دنیا کے اختتام کی بات کر رہا ہے، دراصل جلتا سورج ٹھنڈا ہونا دُنیا کے اختتام پذیر ہونے کی طرف بلیغ اشارہ ہے، کیوں کہ بہت حوالوں سے اس آفاق کو گنبد نما ہی گردانا جاتا ہے۔ اس ضمن میں نظم کا درج ذیل اقتباس دیکھیے:

صبح و شام کے آئینے کا سارا جادو ٹوٹ چکا ہے

سب سے اونچا لاکھوں سال پرُانا گنبد پھٹا ہوا ہے

جلتا سوُرج ٹھنڈا ہو کر پیلی دُھول میں گرا ہوا ہے

اونچا پیڑ ہوا کا پتا پتا ہو کر بکھر گیا ہے

سب سے پرانی خاموشی کا دُھواں فضا میں پھیل رہا ہے

سانپ ہزار زبانوں والا، اپنے زہر سے مرا پڑا ہے(8)

ڈاکٹر سلیم الرحمٰن کی نظموں میں طویل تمثیلی نظم "دریا" انفرادیت کی حامل ہے۔ اس نظم میں وہ فکری وفنی ہر دو طرح سے اپنے اوج پر پہنچے ہوئے ہیں۔ نظم کے چار کردار ہیں۔ خضر ایک ملاح ہے، جب کہ رحمت اس کا ساتھی ہے۔ اکبر نے اپنی بیوی کا قتل کیا ہے اور اپنے بیٹے شاہد کو زبردستی بے ہوشی کے عالم میں کندھے پر لاد کر کشتی کے ذریعے دریا عبور کر کے جنگل کی اور فرار ہونا چاہتا ہے۔ اس ضمن میں اکبر، خضر سے دریا پار جانے کی استدعا کرتا ہے، لیکن طوفانی رات ہونے کے سبب، وہ یہ خطرہ مول لینے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ دریا بپھرا ہوا ہے، جو کشتی کو ڈبو دے گا، یوں اُن میں اک بحث چھڑ جاتی ہے۔ وہ اُس سے دریا پار جانے کی وجہ دریافت کرتا ہے، جب کہ اکبر اُسے ہر صورت دریا پار کرنے کے لیے آمادہ کرتا ہے، اُسے پیسوں کا لالچ بھی دینا چاہتا ہے، لیکن وہ کسی صورت بھی رضا مند نہیں ہوتا۔ اکبر، خضر کی ہمت اور تجربہ کی تعریف کرتا ہے، جس پر وہ گویا ہوتا ہے۔

خضر: میں نے ایسے سیکڑوں طوفان دیکھے ہیں

سخت رُتوں سے گزرا ہوں

اسی لیے تو ایسی اندھی راتوں میں

خطرہ مول نہیں لیتا ہوں

اونچی اونچی لہروں کی دیوار سے جب ٹکراتی ہے

میری کشتی بھی بے بس ہو کے رہ جاتی ہے

اور اُلٹ بھی سکتی ہے

اس طوفان کے باعث میری مجبوری ہے(9)

یہ اُلجھن بڑھتی ہی جاتی ہے اور اکبر بہ ضد ہے، کیوں کہ وہ صبح تک کا انتظار نہیں کر سکتا۔ اُسے کھٹکا لگا ہوا ہے کہ پولیس اُسے تلاش کرتے ہوئے کہیں یہاں تک نہ پہنچ جائے، اسی لیے وہ رات کو دریا عبور کر کے جنگل میں غائب ہو جانا چاہتا ہے۔ خضر اُسے پُل سے گزرنے کا مشورہ دیتا ہے، لیکن وہاں اُسے پکڑے جانے کا خوف لاحق ہے، یہی سبب ہے کہ وہ دریا پار کر کے ہی جنگل میں گُم ہونا چاہتا ہے۔ اسی اثنا میں خضر بار بار اصرار کرتا ہے کہ آخر ایسی کیا افتاد آن پڑی ہے، جو اس وقت جانا ضروری ہے۔ اکبر اُسے من گھڑت کہانی سُناتا ہے، لیکن خضر یقین نہیں کرتا اور اکبر کو پہچان کر اُس سے مخاطب ہوتا ہے۔

خضر: پچھلی باتیں بھول گئے ہو

یا پھر اُنھیں بھلانے کی کوشش میں ہو تم

سُنو! سُنو! میں تم کو یاد دلاتا ہوں

پہلی بار ہم کہاں ملے تھے

چاروں جانب پربت تھے

اور چیل کے پیڑوں کا جنگل تھا

ڈھلوانوں پر لمبی لمبی گھاس اُگی تھی

میدانوں میں دھوپ

میں تم کو اس جنگل سے آوازیں دیتا

اور چوٹی کی سمت بلاتا

تم میری آواز کی جانب بھاگتے

گرتے اور سنبھلتے

ہانپتے کانپتے

سب سے اونچی چوٹی پر آنے کی متواتر کوشش کرتے

بادل کو چھُونے کی خاطر ہاتھ بڑھتے

میں آوازیں دیتا رہتا

پھر آہستہ آہستہ میں رستوں سے اوجھل ہو جاتا ہے

جنگل میں کھو جاتا(10)

مزید بر آں وہ اُسے یاد کراتا ہے تم نے بھی اپنی خواہش سے گھر چھوڑ کر شہر کا رُخ کیا تھا، کیوں کہ اکبر کے والد نے بھی اپنی بیوی کو قتل کیا تھا اور اکبر نے بھی اپنی بیوی قتل کر دی ہے۔ یہاں شہری زندگی کی انا اپنی اوج پر ہے۔ دونوں عورتیں شہری زندگی کی نمائندہ ہیں، جب کہ اکبر اور اُس کا والد شہری تہذیب کی قیدی نسل کی علامت کے طور پر سامنے آتے ہیں، جو شہری زندگی سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر طارق ہاشمی رقم طراز ہیں:

> "اکبر کے باپ نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا تھا اور اکبر نے اپنی بیوی کو۔ قتل کی دو وارداتیں دراصل ایک تسلسل کا اظہار ہیں۔ اکبر اور اس کا باپ دراصل شہری تہذیب و انا کی قیدی نسلیں ہیں اور ان کی بیویاں شہری ماحول کی چمک دمک کی علامت ہیں، جن سے شہری فرد محبت تو کرتا ہے، لیکن اس کی بے چین روح اس سے سخت متنفر ہے۔ اس نفرت کا اظہار اپنی انتہائی شکل میں اس کے قتل کی صورت میں سامنے آتا ہے۔"(11)

جیسے اکبر نے اپنے باپ سے بغاوت کی تھی، ایسے ہی اُس کا بیٹا شاہد بھی بغاوت کرنے پر آمادہ ہے، یہی وجہ ہے کہ اکبر اپنی بیوی کو قتل کرنے کے بعد شاہد کے سر پر چوٹ لگاتا ہے اور بے ہوشی کے عالم میں زبردستی اپنے ہم راہ لے آتا ہے۔ اُدھر اکبر سے خضر کی گفت گو جاری رہتی ہے اور آخر کار وہ اُسے دریا عبور کرنے کے محرکات بتا دیتا ہے۔ اِس پوری نظم میں قدیم اور جدید سوچ کے درمیان ایک کش مکش کو موضوع بنایا ہے۔ نئی اور پرانی نسل ایک دوسرے سے اُلجھتی ہوئی دکھائی ہے۔ پرانی نسل اقدار کی بابت شہری زندگی کو انا بنا لیتے ہیں۔ اس نظم میں بھی ایسا ہی ہوا ہے اور شاہد ہوش میں آتے ہی شہر کا رخ کر لیتا ہے اور جیسے اکبر نے باپ کو چھوڑا تھا، ویسے ہی شاہد، اکبر کو چھوڑ کر شہر کی طرف چل پڑتا ہے۔ اس نظم میں "دریا" کی علامتی حیثیت کو ڈاکٹر تبسم کاشمیری کچھ یوں متعین کرتے ہیں۔

> "اس نظم میں "دریا" "جنگل" "پل" اور "شہر" بنیادی علامتیں ہیں۔ دریا موجودہ زندگی کا بہتا ہوا دھارا ہے۔ جنگل مستقبل کی علامت اور دریا حال کی علامت ہے۔ جسے عبور کر کے جنگل تک پہنچنا ہے۔ شہر متروکہ قدر ہے۔ دریا وہ مقام ہے جہاں ہم سب کھڑے ہیں ماضی کا خوف مسلط ہے۔"(12)

ڈاکٹر سلیم الرحمٰن خضر کی زبانی "دریا" کی علامت کے روپ میں موجودہ زمانے کو بہت فکری انداز سے بیان کرتے ہیں۔ جس سے وقت کی معنویت بہت واضح ہو جاتی ہے۔ انسانی زندگی کی مکمل کش مکش سامنے آجاتی ہے۔ اقتباس دیکھیے ذرا:

خضر: ہم دریا کے رحم و کرم پر رہتے ہیں

ہم سب دریا میں رہتے ہیں

چاہے تو اک لہر اُٹھا کر

سُکھ کے کنارے پر لے جائے

چاہے تو تنکوں کے مانند دور اُڑائے

ریت میں دفن کرے

آنے والا کل اور ماضی

اس دریا کے دونوں کنارے

دونوں آنکھ کا دھوکا،

دونوں بدلنے والے

ایک کنارہ جنگل کی تاریکی ہے

دوسری جانب شہر اور اس کے اُلجھے سایے

پیچیدہ رستوں کا جال(13)

اس ساری نظم میں "دریا" کی معنویت بڑی واضح ہے اور ہم خود کو اُس کے سپرد کیے ہوئے ہیں اور وہ ہمیں اپنی اور بلا رہا ہے۔ ہمیں اسی کی جانب لوٹنا ہے، فی الواقع یہی سچائی ہے، جس سے مُنھ نہیں موڑا جاسکتا۔ اسی لیے ہم دریا کو پکارتے اور خود کو اس کے سپرد کر دیتے ہیں۔

خضر: آؤ! آؤ!

دریا کی آواز سنو

دریا ہم کو اپنی سمت بلاتا ہے

دریا! دریا!

اپنی گود کو پھیلا

ہم آتے ہیں

ہم آتے ہیں

لہرو! لہرو!

ٹھہرو! ٹھہرو!!

ہم آتے ہیں

ہم آتے ہیں(14)

"شام کی دہلیز" میں شامل کم و بیش تمام نظمیں شہری پش منظر رکھتی ہیں۔ بہ قول افتخار جالب یہ ایک شہری انا کا سفر ہے۔ اس سفر میں کہیں ملائمت اور نرمی نام کو نہیں ہے۔ اس پورے مجموعے کی سب سے بڑی تمثیل "دریا" کے روپ میں سامنے آتی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سعادت سعید لکھتے ہیں:

> "اس تمثیل میں شہری زندگی کی انا کے سفر کی داستان ہے۔ تشدد، ہزیمت، ہراس، خوف، اسرار اور تحیّر کی ملی جلی آوازیں اس انا کی تشکیل کرتی ہیں۔"(15)

ازاں بعد جہاں ڈاکٹر سلیم الرحمٰن نے فطرتی حُسن کو خوب صورت تمثالی رنگ میں اُجاگر کیا ہے، وہیں اُن کے ہاں نسوانی حُسن بھی صحت مندانہ انداز میں بڑی آب و تاب سے در آیا ہے۔ نسوانی حُسن کے بیان میں اکثر لڑکی کی علامت کئی طرح سے برتی ہے، بعض اوقات وہ بیمار معاشرے کی علامت بن جاتی ہے اور بعض اوقات لمبے ناخن والی چڑیل بن کر خوف کی علامت کے طور پر آتی ہے۔ اس سب کے باوجود وہی لڑکی من کی آشاؤں کا ایک میلا سا لگا کر نس نس میں اک آگ جیسی کروٹیں لے رہی ہوتی ہے۔ اور وہ اس شوخ اور چنچل لڑکی سے کچھ یوں گویا ہوتے ہیں:

تیرے بالوں میں گجرے کی خوشبو بڑی مست، میٹھی سی ہے

تیرے ہونٹوں پر امرت کی دھاریں ہیں

تُو اپنی آنکھوں میں کاجل سجائے ہوئے کتنی سُندر نظر آ رہی ہے

وہ سُن کے لجائے گی، سمٹے گی

اور پھر ہواؤں کے سرگم پر متوارے نغمے سنائے گی

جیسے کوئی اُس کے دل کے کناروں کو

چپکے سے چھوُنے لگا ہو(16)

سلیم الرحمٰن کی نظم میں علامتی پہلو سب سے زیادہ جان دار ہے، جو انھیں اپنے ہم عصر شعرا سے ممتاز بناتا ہے اور ہم بلا تردد کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے علامتی نظم میں بیش بہا اضافے کیے ہیں۔ جس سے اردو نظم کا دامن مالا مال ہوا ہے۔

حواشی و حوالہ جات

1۔ اشتیاق احمد، جدید علامت نگاری: تحقیقی و تنقیدی جائزہ، لاہور: کتاب سرائے، 2018، ص226

2۔ عارفہ بتول، جدید اُردو نظم میں تصورِ انسان، مقالہ برائے پی ایچ-ڈی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، 2016ء، ص349

3۔ محمد حسن، پروفیسر، اصل سے بچھڑنے کا دُکھ، مشمولہ "منظر جاگتا سوتا ہوا" "کلیات" سلیم الرحمٰن، ڈاکٹر "لاہور: ملٹی میڈیا افیئرز، 2007، ص163

4۔ سلیم الرحمٰن، ڈاکٹر، منظر جاگتا سوتا ہوا، ص38،37

5۔ ایضاً، ص52

6۔ ایضاً' ص54

7۔ ایضاً، ص61

8۔ ایضاً، ص64

9۔ ایضاً، ص71

10۔ ایضاً، ص76

11۔ طارق ہاشمی، ڈاکٹر، جدید نظم کی تیسری جہت، فیصل آباد: شمع بکس، 2004ء، ص164

12۔ تبسم کاشمیری، جدید اُردو شاعری میں علامت نگاری، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 1975، ص339

13۔ سلیم الرحمٰن، ڈاکٹر، منظر جاگتا سوتا ہوا، ص84

14۔ ایضاً، ص92

15۔ سعادت سعید، ڈاکٹر، بصارتی بصیرتوں کا شاعر، مشمولہ: منظر جاگتا سوتا ہوا "کلیات" سلیم الرحمٰن، ڈاکٹر "ص10

16۔ سلیم الرحمٰن، ڈاکٹر، منظر جاگتا سوتا ہوا، ص31